© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ترجمان القرآن کے گزشتہ شمارے میں ہم نے یہ عرض کیا تھا کہ اضطراب کی جس لہر نے اس وقت پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے وہ کسی وقتی اور ہنگامی سبب کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے بعض گہرے اسباب ہیں جنہوں نے ہماری اجتماعی زندگی کے دھارے میں غیر معمولی ہلچل پیدا کردی ہے۔ اسی ضمن میں ہم نے چند اسباب کی نشاندہی بھی کی تھی۔ اِن صفحات میں ہم بعض ایسی تدابیر کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے نزدیک ہماری زندگی کی جوئے رواں میں نہ صرف سکون اور اعتدال پیدا کرسکتی ہیں بلکہ ہماری کشتِ ویراں کو جلد از جلد سرسبز و شاداب کرکے اُمتِ مُسلمہ اور پُوری انسانیت کے لیے طمانیت بھی فراہم کرسکتی ہیں۔

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً وَّھَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا۔

اصلاحِ حال کی کوشش کے سلسلے میں حکمراں طبقہ کو یہ بات پُوری طرح ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ اگر وہ محض قوت کے بل بوتے پر اور پولیس کے ناروا تشدّد اور نوکرشاہی کے جبر و استبداد سے حالات میں اعتدال پیدا کرنا چاہتا ہے تو وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہے جسے وہ جتنی جلدی اپنے ذہن سے نکال دے اُتنا ہی ملک اور قوم کے لیے اور خود اُس کے لیے مفید ہے۔ تشدّد کے ذریعہ نہ تو آج تک کبھی حق کی آواز دبی ہے اور نہ عوامی احساسات کو کچلا جاسکتا ہے۔ جو حقائق سورج کی طرح عیاں اور سانس کی طرح ہماری زندگی کے قریب اور اُس پر اثر انداز ہونے والے ہوں انہیں آخر عوام تشدّد کے خوف سے کس طرح جھٹلا سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ وقتی طور پر خاموش ہو جائیں مگر اُن کے دل و دماغ میں تو یہ حقائق موجود رہیں گے۔ اور خارجی دباؤ کی وجہ سے وہاں طوفان اٹھاتے رہیں گے، اور دیر یا سویر یہ سیلِ بے پناہ کی صورت اختیار کرکے غلط راستوں پر بہہ نکلیں گے۔ اور اگر ایک مرتبہ یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لاوا پھوٹ پڑا تو پھر ہمارے فکر و نظر کا کوئی گوشہ اور ہماری زندگی کا کوئی شعبہ اس کی زد سے محفوظ نہ رہے گا۔ ماضی کو تو جانے دیجیے اِس تشدّد کے ردّ عمل کے لاتعداد رُوح فرسا واقعات انقلاب فرانس اور انقلاب روس میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مظلوم اور پسے ہوئے طبقے غالب گروہوں سے بڑی عاجزی اور انکساری کے ساتھ پہلے محض جینے کا حق مانگتے تھے اور اُن کے جذبۂ رحم سے اپیل کرتے ہوئے ان سے بار بار یہ کہتے تھے کہ آخر ہم بھی انسان ہیں، ہمیں بھی جسم و جان کے رشتے کو قائم رکھنے کے لیے بنیادی ضروریات درکار ہیں، ہم بھی انصاف کے مستحق ہیں، ہمیں بھی اپنی عزتِ نفس کا کچھ احساس ہے، خدارا ہمارے ساتھ حیوانوں اور درندوں کا سا سلوک نہ کرو۔ مگر اقتدار کے نشے میں بدمست طبقوں نے ان کی آہ و فغاں پر بالکل کان نہ دھرے اور نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک ایسا طوفان اٹھا جس نے پوری زندگی کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔

ملک کے اُفق پر اس وقت جو تاریک گھٹائیں چھا رہی ہیں اور عوام کے دل میں اپنے ماحول کے خلاف حقارت و نفرت کے جو جذبات اُمڈ رہے ہیں، وہ کسی شدید طوفان کا پیش خیمہ ہیں۔ خدا کرے کہ ہمارے ملک کے اربابِ بست و کشاد اس طوفان سے پہلے سنبھل جائیں اور دیانتداری سے اصلاحِ حال کی کوشش کریں اور اس تباہی سے ملک اور قوم کو بچائے جائیں جو اس قسم کے طوفان کے ساتھ لازمی طور پر آتی ہے۔ یہ طوفان جب اُٹھتے ہیں تو صرف حکومت کرنے والے ہاتھ ہی تبدیل نہیں ہوتے بلکہ ماضی کی ساری اقدار بھی نیست و نابود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ فرانس میں جب یہ طوفان اٹھا تو اس سے جاگیرداری اور پاپائیت کا محل تو بلاشبہ مسمار ہو گیا مگر اس کے ساتھ ہی مذہب اور اُس کی ساری تعلیمات بھی خس و خاشاک کی طرح بہ گئیں اور نہ صرف فرانس بلکہ سارا یورپ الحاد کے اندر غرق ہو گیا۔ اسی طرح جب روس میں اس انقلاب کے شعلے بلند ہوئے تو صرف زارِ روس اور اُس کے حامیوں کا تسلط ہی ختم نہ ہُوا بلکہ انسانیت کے وہ سارے ضابطے اور اصول بھی جنہوں نے انسان کو انسان بنانے میں بہت بڑی خدمت سرانجام دی تھی، راکھ بن کر رہ گئے۔ اور انسانیت کو روحانی اور اخلاقی اعتبار سے بالکل ابتدا سے اپنے سفر کا آغاز کرنا پڑا۔ ہمارے ملک کے سارے بہی خواہوں کو ان واقعات سے عبرت پکڑنی چاہیے اور کبھی اس بات کی کوشش نہ کرنی چاہیے کہ چڑ اور ضد میں آ کر کوئی ایسی صورتِ حال پیدا کر دی جائے جس میں تبدیلی کے جذبات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غلط رُخ پر بہہ نکلیں اور ملت ایک ایسے طوفان کی گرفت میں آجائے جس میں اُس کا سارا اخلاقی اور دینی اثاثہ ہی بالکل برباد ہو کر رہ جائے۔

اصلاحِ احوال کے لیے ہمارے نزدیک سب سے ضروری چیز نصب العین کا نہایت واضح تعین ہے۔ پوری قوم ۲۲ سال سے اندھیرے میں ہاتھ ٹوئیاں مار رہی ہے اور اُسے ابھی تک طے کر کے یہ بتایا نہیں گیا کہ اس کی حقیقی منزلِ مقصود کیا ہے۔ یُوں تو ملک کے سربراہ قوم کو ہمیشہ یہی بشارت دیتے چلے آرہے ہیں کہ وہ اس کے دامن کو اسلام کی نعمت سے بھرنے کا عزم رکھتے ہیں لیکن قوم بیچاری اس نعمتِ عظمیٰ کی کوئی معمولی سے معمولی مقدار بھی پا نہیں سکی بلکہ وہ بیچاری تو انتہائی تشویش کے عالم میں یہ دیکھتی ہے کہ دینِ حق کا جو بچا کھچا سرمایہ اُس کے پاس تھا، وہ اُس سے بھی محروم کی جا رہی ہے۔ اسلام کا نام اور اس کے ساتھ برسرِ اقتدار طبقوں کی عقیدت مندی کے اعلانات سُن سُن کر اس کے کان پک چکے ہیں۔ اور وہ اب یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی ہے کہ اسلام اس گروہ کے نزدیک محض ایک سیاسی چال یا دلفریب نعرہ ہے جس سے وہ اُسے کئی برس سے بیوقوف بنا رہا ہے۔ اس اُمتِ وسط کو عملی طور پر مغربی افکار کا غلام اور مغربی تہذیب و تمدن کا نمونہ بنایا جا رہا ہے، مگر وابستگی اسلام سے ظاہر کی جا رہی ہے تاکہ یہ کہیں اپنے آقاؤں کی کوششوں سے برگشتہ نہ ہو جائے۔

اسلام جس طرزِ فکر اور جس طرزِ عمل کو دنیا سے مٹانے آیا ہے اس کی پُوری طرح سرپرستی ہو رہی ہے بلکہ اس بات کا پُورا پُورا التزام کیا جا رہا ہے کہ یہ جلد ہی قوم کے رگ و پے میں پُوری طرح سرایت کر جائے اور جو لوگ اس راہ میں مزاحم ہوں انہیں نیست و نابود کر دیا جائے۔ لیکن جہاں تک زبانی دعووں کا تعلق ہے، ہر موقع پر یہی کہا جاتا ہے کہ انہیں اسلام ہی سب سے زیادہ عزیز ہے۔ اسلام کے ساتھ اس قسم کے کھلے اور شرمناک مذاق کو آخر عوام کب تک برداشت کر سکتے ہیں۔ اسلام کوئی خوابِ پریشان تو نہیں کہ جس کی ہر اُلٹی سیدھی تعبیر کو لوگ قبول کر لیں۔ اسے باری تعالیٰ نے سورج سے زیادہ روشن دلائل کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور پھر اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خود اپنی نگرانی میں اس کا مثالی طور پر نفاذ کروا کر اس کی عملی صورت کو بھی پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ کوئی گروہ یا قوم اسے اپنائے یا نہ اپنائے، اس کو اختیار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ لیکن یہ بات کسی طرح ممکن نہیں کہ اس کا نام لے کر لمبے عرصے تک کسی کو دھوکہ دیا جائے۔ کوئی فرد جب اسلام کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے تو اس سے اس امر کی بجا طور پر توقع کی جاتی ہے کہ وہ خدا سے ڈرنے والا، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی پیروی کرنے والا، کھلے اور چھپے معاملات میں حق و صداقت کی راہ پر گامزن ہونے والا اور نوعِ بشری کے ساتھ نرمی اور بھلائی کا برتاؤ کرنے والا ہو۔ بالکل اسی طرح جب کوئی صاحبِ اقتدار یہ کہتا ہے کہ وہ اسلام کا شیدائی ہے اور وہ اس دینِ حق کو ہی انسانی فوز و فلاح کا ضامن سمجھتا ہے تو پھر انسان بالکل فطری طور پر اس بات کا متوقع ہوتا ہے کہ وہ اپنے اقتدار اور اختیار کو اسلام کی سربلندی کے لیے استعمال کرے گا اور ملک کے جملہ وسائل اُن بھلائیوں کو فروغ دینے کے لیے وقف ہوں گے جنہیں اسلام پروان چڑھانا چاہتا ہے اور اُن برائیوں کے استیصال کے لیے صرف ہوں گے جنہیں اسلام مٹانے کا متمنی ہے۔ ایک اَن پڑھ سے اَن پڑھ مسلمان اتنا تو بہر حال جانتا ہے کہ اسلام کو اگر دیانت داری سے اپنایا جائے تو اس سے مندرجۂ ذیل نتائج بہر طور پیدا ہوتے ہیں۔

- استبداد کا خاتمہ۔ کیونکہ اسلام عدل و انصاف کا علمبردار ہے۔
- فحاشی اور بدمعاشی کا قلع قمع کیونکہ اسلام انہیں انسانیت کے لیے خطرناک قسم کے روگ سمجھتا ہے۔
- ہر قسم کے ناجائز استحصال کی بیخ کنی، کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ چوری اور ڈاکہ زنی سے قبیح جرم ہے۔
- رشوت ستانی، چور بازاری، سٹہ بازی، سود، اکتنازِ دولت اور ارتکازِ دولت کا خاتمہ، کیونکہ یہ معائب اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ انسان، انسانیت کی بنیادی اقدار سے یکسر محروم ہو چکا ہے اور اُس نے دولت کو اپنا الٰہ بنا لیا ہے۔
- اسلامی معاشرے کے ہر فرد کو بنیادی ضروریات کی فراہمی، کیونکہ اسلام نے مملکت پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے۔
- تحریر و تقریر کی آزادی، کیونکہ یہ انسان کا ایسا پیدائشی حق ہے جو اُسے خداوندِ قدوس نے عطا کیا ہے۔
- مملکت کے اندر رہنے والے تمام افراد کے درمیان مساوی سلوک کیونکہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے درمیان بجز نیکی اور تقویٰ کے اور کوئی تمیز روا نہیں رکھتا۔ سب انسان ایک ہی باپ کی اولاد ہیں اس لیے سب کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درمیان عدل و مساوات قائم ہونی چاہیے۔

• اللہ اور اُس کے رسول کے عائد کردہ فرائض کی بجا آوری۔

• مسندِ اقتدار سنبھالنے میں عوام کی منشا اور مرضی اور امورِ مملکت چلانے میں خدا اور خلق دونوں کے سامنے مسئولیت۔

اسلام کی اجتماعی زندگی کے یہ وہ چند بنیادی اصول ہیں جو تمام مسلمانوں کے ذہن میں پوری طرح محفوظ ہیں بلکہ جن کی جڑیں ان کے جذبہ و احساس میں گہری اتری ہوئی ہیں۔ پھر ان اصولوں کی عملی شکل ان کے سامنے ہے۔ انہیں اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ ہادیِ برحق حضور سرورِ دو عالم اور اُن کے رفقائے کار (اللہ تعالیٰ اُن سب پر اپنی بے پایاں رحمتیں نازل کرے) نے کس طرح فقیری میں شاہی کا عملی نقشہ پیش کیا، انہوں نے کس طرح غریب اور کمزور کے حقوق کی حفاظت اور پاسبانی کی، انہوں نے معاشرے میں برائیوں کا کس طرح خاتمہ کیا۔ انہوں نے انسان کو اسلامی اخلاق کا پیکر بنانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کیں۔ انہوں نے اپنے اختیارات کو کس احساس ذمہ داری اور فرض شناسی کے ساتھ استعمال کیا۔ انہوں نے کس دردمندی کے ساتھ یتیموں، بیکسوں اور بیواؤں کی دستگیری کی۔ انہوں نے عوام کی جان و مال اور عزت و آبرو کی محافظت کا فرض کس گہرے خلوص کے ساتھ سرانجام دیا، اور سب سے بڑھ کر اقتدار کے بار کو کس طرح اللہ کی طرف سے ایک مقدس امانت سمجھ کر اٹھایا اور اسے اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ جمانے کے بجائے آخرت کی کامرانی کا ذریعہ بنایا۔ ان تصورات کے ذہن میں پوری طرح موجود ہوتے ہوئے کوئی مسلمان آخر یہ کس طرح باور کر سکتا ہے کہ اس ملک کے برسرِ اقتدار طبقے اسلام کے معاملے میں مخلص ہیں اور فی الواقع وہ یہاں اس دین کو سربلند دیکھنا چاہتے ہیں۔

ان لوگوں نے شاید یہ سمجھ رکھا ہے کہ اسلام کے نام پر وہ مدتِ مدید تک مسلمانوں کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہوں گے مگر یہ محض ابلہ فریبی ہے۔ اسلام کوئی خارزار نہیں بلکہ یہ پھل دینے والا سایہ دار درخت ہے۔ جب کوئی قوم اپنے قلب و دماغ میں ایمان کا بیج بو کر عملِ صالح کے ذریعے اس کی باقاعدہ آبیاری کرتی ہے تو یہ درخت تنومند ہو کر اُس پر امن کا سایہ کرتا ہے اور اُسے ظلم و استبداد کی تپش سے بچاتا ہے۔ پھر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُس کی جھولی میں ایک صالح نظامِ تمدن، ایک عادلانہ نظامِ سیاست اور معیشت کے پھل ٹپکاتا ہے تاکہ لوگوں کی رُوح کو چین اور جسم کو آرام نصیب ہو۔ مسلم قوم کبھی اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی کہ اسلام کا درخت بار آور نہ ہو۔ مسلمان اس درخت کے حیات آفریں سایئے کی وسعت اور اس کی ٹھنڈک کو اچھی طرح جانتے ہیں اور اُس کے پھلوں کی شیرینی سے بھی پُوری طرح لذت آشنا ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ سخت غلطی پر ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جھوٹے پروپیگنڈے کے زور سے مغربی تہذیب کے منحوس درخت کے تاریک سائے اور شجرِ اسلام کے طمانیت بخش سائے کے درمیان جو واضح امتیاز ہے اُسے مسلمانوں کے ذہنوں سے مٹانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور مغربی تمدّن کے کڑوے پھل کے متعلق یہ باور کرا سکیں گے کہ یہ اسلام کے ہی ثمرات ہیں۔ مسلمان قوم کو آخر اتنا بیوقوف کیوں سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ اتنی سادہ سی حقیقت بھی سمجھنے سے اب قاصر ہے کہ جس دین کو باری تعالیٰ نے خلق کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے بھیجا ہے اس میں جور و استبداد اور لوٹ کھسوٹ کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اس میں انسانوں کی خدائی کا سکہ کبھی نہیں چل سکتا۔ اس میں لوگوں کو ان کے انسانی حقوق سے کبھی محروم نہیں کیا جا سکتا۔ جس خدا نے اس کائنات کو حق اور انصاف کے ساتھ پیدا کیا ہے اور چیونٹی سے کر ہاتھی تک سب کے لیے رزق کا سامان فراہم کیا ہے اس کے نظام کے بارے میں آخر ناانصافی اور وسائلِ رزق سے محرومی کا تصور کس طرح ہو سکتا ہے۔

اس لیے ہم اس ملک کے اربابِ اقتدار اور دوسرے رہنماؤں اور سربراہوں کی خدمت میں یہ بات بڑی دردمندی سے کہنا چاہتے ہیں کہ اس ملت کی فلاح و بقا کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کو بطور سیاسی چال استعمال کرنے کے پُرانے مشغلے کو چھوڑ کر اس کے ساتھ سچی وابستگی پیدا کی جائے۔ دینِ حق کے ساتھ عقیدت مندی کے اعلانات سے اب لوگوں کے جی بھر چکے ہیں اور اُن کے لیے مجرد ان خوش کُن بیانات میں اب کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ وہ اب اسلام کے نعروں سے اپنا دل بہلانے پر کسی صورت بھی تیار نہیں ہو سکتے۔ اب وہ اس بات کے آرزومند ہیں کہ اسلام فی الحقیقت آئے اور اُن کی بگڑی بنائے۔ وہ اُن کے قلب و دماغ کو منور کرے، وہ ان کی معاشرت میں پاکیزگی پیدا کرے، وہ اُن کی سیاست کو خدا ترسی کی فضا سے معمور کر دے وہ ان کی معیشت کو ظلم و استبداد سے محفوظ کر کے عدل و انصاف کی بنیاد پر از سرِ نو استوار کرے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دنیا میں اس سے بڑا اور کوئی ظلم نہیں کہ کسی مقدس شئے کی تقدیس کے نام پر لوگوں کو فریب دیے جائیں اللہ کے قانون نے کبھی اس مذموم کاروبار کو دیر تک دنیا میں چلنے نہیں دیا۔ اس نے اس قسم کی فریب کاری کرنے والوں کی فریب کاریوں کا پردہ چاک کرکے مقدس چیزوں کی تقدیس کی پوری طرح حفاظت کی ہے تاکہ دنیا میں اُن کی عظمت جوں کی توں قائم رہے۔ البتہ جو لوگ اس قسم کے دھندے کرتے ہیں انہیں دنیا میں ہمیشہ ذلیل اور رسوا کیا ہے۔ رب العزت کی غیرت آخر اس بات کو کس طرح گوارا کرسکتی ہے کہ عیار لوگ اس کے مقدس دین کو بازیچہ اطفال بنائیں اور سچے دل سے اس کی پیروی کرنے کے بجائے اُسے قوت و طاقت حاصل کرنے کے لیے بطور آلہ کار استعمال کریں۔ اس بنا پر ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ قوم کی اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہوسکتی جب تک ہم اسلام کے بارے میں خلوص نیت کے ساتھ کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرلیتے۔

اگر کسی گروہ کو اسلام واقعی عزیز ہے تو پھر اُسے اس معاملے میں پوری یکسوئی کا ثبوت دینا چاہیے اور اپنے عمل سے اس بات کو ثابت کردینا چاہیے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں فلاح و کامرانی کا راز صرف اسلام کو اپنانے میں سمجھتا ہے۔ اور اگر کسی طبقے کو اسلام کے علاوہ کچھ دوسرے نظریات اور زندگی کے دوسرے ضابطے پسند ہیں تو پھر انہیں کھل کر اس امر کا اعلان کرنا چاہیے۔ اسپرٹ سرکے اور شراب سے بھری ہوئی بوتلوں پر شہد کے لیبل لگا کر انہیں اب عوام میں بطور شہد بیچنا ممکن نہیں رہا۔

اسی ضمن میں یہ عرض کردینا بھی ضروری ہے کہ اب ملکی استحکام، قومی یک جہتی، مضبوط مرکز، اتحاد و اتفاق اور ایثار و قربانی کی کھوکھلی اپیلوں میں کوئی وزن باقی نہیں رہا۔ بیرونی خطرات کے خوف کا ہتھیار بھی اب بالکل کند ہوچکا ہے۔ لوگ ان میں سے کسی کو بھی اب قطعاً کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ سالوں کے تلخ تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ محض الفاظ کے خوشنما پیکر ہیں جن میں برسر اقتدار گروہوں کی خود غرضی چھپی ہوئی ہے۔ اگر ملکی استحکام ان طبقوں کو بھی فی الحقیقت عزیز ہے اور ایثار و قربانی میں وہ خود بھی یقین رکھتے ہیں تو وہ اس مقصد کی خاطر پہلے خود کیوں ایثار پر آمادہ نہیں ہوتے۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر کسی نیک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا یقیناً قابل ستائش طرزِ عمل ہے لیکن عوام اس ایثار کا اس وقت مظاہرہ کرتے ہیں۔ جب رہنما نے خود اپنے پیٹ پر دو پتھر باندھ رکھے ہوں۔ ہمارے حکمران اور ان کے حاشیہ نشین خود تو ہر وقت مادی مفادات کے حصول میں نہمک رہتے ہیں مگر عوام کو ایثار و قربانی کا وعظ سنایا جاتا ہے۔ اس قسم کے وعظ آج تک کبھی موثر ثابت نہیں ہوئے بلکہ اس انداز کی تلقین کرنے والوں کے خلاف حقارت ونفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہی نصیحت سب سے زیادہ اثرانگیز ہوتی ہے جس پر خود ناصح عمل پیرا ہو۔ ورنہ وہ عوام کے نزدیک الفاظ کی بازیگری بن کر رہ جاتی ہے۔

نصب العین کے تعین کے بعد اصلاحِ حال کے لیے دوسری بڑی چیز اُس طریقِ کار کا تعین ہے جس کے مطابق حکومت کرنے والے ہاتھوں کو قوم حسب خواہش تبدیل کر سکے۔ ہمارے ہاں چند حضرات کی خود غرضی اور عاقبت نااندیشی کی وجہ سے اقتدار ایک ایسا مضبوط حصار بن چکا ہے جس میں جب کوئی فرد یا گروہ ایک مرتبہ گھس جاتا ہے تو اپنے آپ کو رائے عامہ کے اثرات سے یکسر محفوظ پاتا ہے اور بڑی بے خوفی کے ساتھ من مانی کارروائیاں کرتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو فرد یا گروہ بھی قوت و طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے وہ رائے عامہ کو ہموار کرنے کے صبر آزما کام کرنے کے بجائے کسی نہ کسی طرح تختِ اقتدار پر قابض ہونے کی کوشش کرتا ہے تاکہ قوت کا مرکز اس کے ہاتھ میں آجائے۔

ہمارے ملک کے باشندوں کے ذہنوں میں جب تک یہ خیال پوری طرح راسخ نہ ہوگا کہ قیادت اور سربراہی صحیح ہے جس کی پُشت پر عوامی تائید ہو، اُس وقت تک ہمارے ہاں کسی پائیدار اجتماعی زندگی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

قرآن مجید نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر کرتے ہوئے اس امر کی تصریح کی ہے کہ اگرچہ وہ رہنمائی خدا سے حاصل کرتے ہیں مگر وہ انسانی برادری ہی کے ایک فرد ہیں اور انسانی معاشرے کے ایک رُکن کی حیثیت سے انہیں رسالت کے کام پر مامور کیا گیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت پُوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ قیادت کے منصب پر فائز ہونے اور اس کی اصلاح کے لیے صحیح خطوط پر جدوجہد کرنے کے لیے یہ چیز ازبس ضروری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ قائد اور سربراہ عوام کے ساتھ مشترک انسانی جذبات کے رشتوں میں بندھا ہو۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ صرف ذہنی اعتبار سے نہیں بلکہ جذبہ و احساس کے لحاظ سے بھی اُسے اس بات کا پوری طرح علم ہو کہ عوام کن کن مصائب میں گرفتار ہیں۔ کون کون سے اخلاقی اور روحانی عوارض انہیں گھن کی طرح کھائے جا رہے ہیں اور انہیں ان مصائب اور عوارض سے نجات دلانے کے لیے کس قدر محنت اور ایثار درکار ہے۔ پھر وہ اس انتہائی نازک ذمہ داری کو صدقِ دل کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ بھی ہوں۔ صرف ایک جست لگا کر عوام کی گردنوں پر مسلط ہو جانے سے تو اس فرض کو اچھی طرح سرانجام نہیں دیا جا سکتا جب بھی تسلط کا یہ آسان اور سہل راستہ اختیار کیا جائیگا تو پھر مسلط ہونے والوں کی ساری توجہ صرف اسی بات پر مرکوز رہے گی کہ کسی نہ کسی طرح تسلط کے دَور کو زیادہ سے زیادہ طویل کیا جائے اور عوام کی گردنوں پر ایسے مضبوط پنجے گاڑے جائیں کہ وہ کبھی بھی آزاد نہ ہو سکیں۔ اس مقصد کے لیے جبر و استبداد کے سارے حربے استعمال کیے جائیں گے۔ لیکن اس قسم کا تسلط عوام اور اُن کے قائدین دونوں کے لیے تباہ کن ہوتا ہے۔

بدقسمتی سے ہم قیادت و سیادت کے اس آسان اور سستے نسخے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اس عظیم منصب پر فائز ہونے کے لیے ہم کوئی محنت طلب اور طویل جدوجہد کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہو سکتے بلکہ کسی موزوں موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ حالات ذرا سازگار ہوں اور وہ جھٹ سے تختِ شاہی پر متمکن ہو جائیں۔ اس بنا پر وہ عوام کی خدمت کے بجائے ہمیشہ حالات کے مدوجزر کو دیکھتے ہیں اور جونہی مناسب موقع پاتے ہیں عوامی احساسات کی لہروں کے ساتھ بڑی تیزی کے ساتھ بہہ کر ساحل مراد پر جا پہنچتے ہیں۔ انہیں کبھی اس بات کی فکر دامنگیر نہیں ہوتی کہ وہ ان بپھری ہوئی لہروں میں اعتدال پیدا کر کے انہیں ایک مستقل قوت کی شکل میں منظم کریں اور پھر ان سے تعمیر کا کام لیں۔ انہیں اِن کی تندی و تیزی سے ہی غرض ہوتی ہے اس لیے وہ ان سے اُس وقت تک فائدہ اٹھاتے ہیں جب تک کہ ان میں شدید اضطراب موجود ہو مگر جونہی ان لہروں کا اضطراب ختم ہونے لگتا ہے تو اس سے کام لینے والے بھی ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم اپنے فرض میں کوتاہی کریں گے اگر ہم اس ملک کی قیادت کی خدمت میں یہ عرض نہ کر دیں کہ خدا نے اسے عوامی مقبولیت کے جو زرّیں مواقع فراہم کیے ہیں ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُسے کوئی ایسا ٹھوس لائحہ عمل تیار کرنا چاہیے جس سے ملک و ملّت کو کوئی پائیدار فائدہ حاصل ہو اور عوام کی اس انداز پر تربیت ہو سکے کہ ان کے اندر اپنے حقوق اور فرائض کا احساس ایک نہ بجھنے والے شعلے کی طرح ہمیشہ موجود رہے اور انہیں سرگرم رکھے۔ اس کام کے لیے طویل محنت، شدید ریاضت اور بے مثال قربانی کی ضرورت ہے۔ زندگی نہ بھڑکنے کا نام ہے، نہ بُجھ جانے کا، بلکہ سُلگتے رہنے کا نام ہے۔ چنانچہ عوامی تحریکات کے جو شعلے آناً فاناً بھڑک کر بُجھ جاتے ہیں وہ اپنے پیچھے سوائے راکھ کے چند ذرات کے اور کوئی چیز نہیں چھوڑتے مگر اجتماعی جدوجہد کی وہ لو جس کے پاس ہمیشہ روشن رہنے کا سامان موجود ہو وہ قوموں کو مدتِ دراز تک نور اور حرارت مہیا کرتی ہے۔ جو قوم اس لو سے منور ہو اس میں مایوسی کی تاریکیاں کبھی راہ نہیں پا سکتیں۔

اس لو کو مستقل قائم رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس امر کا التزام کیا جائے کہ وہ روغن ختم نہ ہونے پائے جس سے اس کی زندگی وابستہ ہے۔ یہ روغن نصب العین کی سچی محبت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہماری قیادت کو اپنی پوری توجہ اس بات پر صرف کرنا چاہیے کہ عوام کا اُن کے نصب العین کے ساتھ بڑا گہرا ربط قائم ہو اور وہ اُن کے قلب و دماغ میں اس طرح رچ بس جائے کہ وہ زندگی کے سارے معاملات کو اسی کی روشنی میں دیکھنے اور اسی معیار کے مطابق پرکھنے کے عادی ہو جائیں۔ جب تک یہ بات پیدا نہیں ہوتی اُن کے فکر و عمل کا دھارا کوئی تعمیری رُخ اختیار نہیں کر سکتا۔

اجتماعی زندگی کے چراغ تو بلاشبہ نصب العین کے عشق سے ہی جلتے ہیں مگر اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اسے اخلاقی بے راہروی کی یورشوں سے بچایا جائے۔ ضبطِ نفس سے عاری قوم طوفان اٹھا سکتی ہے، شورشیں برپا کر سکتی ہے، ہنگامے کھڑے کر سکتی ہے مگر تعمیر و ترقی کا کوئی مستقل اور پائیدار کام نہیں کر سکتی۔ اخلاق ہی سے قوموں کو ایثار اور قربانی کی تربیت ملتی ہے۔ انسان جب تک اپنے نفس کو آئین و ضوابط کا پابند نہیں بناتا اُس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وقت تک وہ کوئی ٹھوس اجتماعی کام نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جن حضرات نے بھی خلوص کے ساتھ انسانیت کی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے انہوں نے اخلاقی اصلاح اور تہذیبِ نفس پر خاص طور پر توجہ دی ہے۔ جب تک نفس کی تہذیب نہیں ہوتی تمدن کا کوئی مضبوط ڈھانچہ کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔

دنیا کے سارے کاموں میں غالباً سب سے زیادہ مشکل کام یہی تہذیبِ نفس کا کام ہے۔ انسان کے لیے سر بفلک عمارات اور بڑے بڑے کارخانے تعمیر کر لینا اور کثیر پیدا آوری اور زود پیدا آوری کے شاندار ریکارڈ قائم کر لینا بلکہ چاند اور سورج پر اپنا قبضہ جما لینا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ اپنے آپ کو زندگی کی اعلیٰ و ارفع اقدار کا پابند بنا کر صحیح معنوں میں انسان بنانا ہے۔ اس کے لیے بے حد خلوص، بڑی دلسوزی اور دردمندی اور غیر معمولی تدبر درکار ہے۔ اس کام کی ذمہ داریاں باغبان کی ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ مشکل ہیں۔ انسانوں کا مالی سب سے پہلے اُن کے قلب و دماغ کو باطل افکار و نظریات کی جھاڑ جھنکاڑ سے صاف کر کے انہیں حق کی قبولیت کے لیے تیار کرتا ہے۔ پھر ان میں صداقت کے بیج بو کر اُن سے پاکیزہ عادات اور صالح اعمال کا گلستان ترتیب دیتا ہے۔

مالی اگرچہ اپنی نگاہ ایک ایک پھول اور ایک ایک کلی پر رکھتا ہے مگر اس کے سامنے پُورے گلستان کی ترتیب ہوتی ہے، کیونکہ جب تک پُورے ماحول میں نیکی کی مہک موجود نہ ہو اس وقت تک گلستان کے وجود کا مقصد پُورا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ بھلائی کے کسی کام کو بھی مؤثر انداز سے کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُس کے لیے اجتماعی جدوجہد کی جائے۔

ہمارے اس ملک میں سیاسی یا دینی جماعتوں کے الگ الگ وجود کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں جو ایک عام انقباض سا پایا جاتا ہے وہ ایک غلط اندازِ فکر کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے غلطی سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ کسی جماعت کا الگ وجود ہی افتراق کی علامت ہے۔ اور یہ ہر صورت میں اجتماعی مفاد کے لیے خطرے کا باعث ہے۔ یہ نقطۂ نظر درحقیقت یورپ میں اجتماعی جکڑ بندیوں اور یک جماعتی ریاست کے بڑھتے ہوئے رجحانات نے پیدا کیا ہے۔ اگر کوئی جماعت ملت کے اندر انتشار پیدا کرنے کے لیے قائم کی جاتی ہے تو وہ واقعی خطرہ ہے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جتنی جلدی وہ ختم ہو جائے اتنا ہی ملت کا فائدہ ہے۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ہر جماعت لازمی طور پر افتراق پیدا کرنے کے لیے معرضِ وجود میں نہیں آتی۔ جماعت ایک اجتماعی قوت کا نام ہے۔ اس سے نہایت اچھے مقاصد بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ خصوصاً انسانوں کی تربیت کے لیے تو جماعتوں کا وجود ہمیشہ ایک بہت بڑی نعمت ثابت ہوا ہے۔ اگر ان کے قیام کا مقصد نیک ہو تو ان کی حیثیت ملت کی کیاریوں کی سی ہوتی ہے جو سب مل کر اس کی اجتماعی فضا میں حسن پیدا کرتی ہیں۔

ہر انسان اپنا ایک الگ مزاج اور سوچنے سمجھنے کا ایک جداگانہ انداز لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس کی نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسے ماحول میں لے آئے جو اُس کے مزاج اور اندازِ فکر سے مناسبت رکھتا ہو تاکہ اُس کی ذہنی صلاحیتیں بہرہ مند ہو سکیں۔ اگر وہ اکیلا رہے گا تو دونوں صورتوں میں ایک صورت بہرحال اُسے پیش آئے گی یا تو اُس کی شخصیت بے جان رہے گی کیونکہ انسان اجتماعی سرگرمیوں کے جتنا قریب ہو اسی نسبت سے اُسے غذا حاصل ہوتی ہے یا پھر وہ اتنا خود پسند اور انا پرست ہو گا کہ اجتماعی زندگی کی کسی ذمہ داری کو وہ کامیابی کے ساتھ قبول نہ کر سکے گا اور وہ ہمیشہ اس امر کا خواہاں رہے گا کہ پوری قوم بلکہ پوری انسانیت اس کی تابع ہو اور ہر فرد اُس کی ہر خواہش کا احترام کرے۔ یہ دونوں حیثیتیں ایک غیر متوازن زندگی کا اظہار ہیں۔ شخصیت کی صحت مندانہ تعمیر کے لیے اجتماعی زندگی کی ذمہ داریاں قبول کرنا ازبس ضروری ہے۔ ان سے ایک طرف فرد کو اجتماعیت کی قوت و توانائی حاصل ہوتی ہے اور دوسری طرف حیاتِ اجتماعی میں اُسے کسر و انکسار کے ساتھ جینے کا ڈھنگ آتا ہے۔ جماعت اُس کے لیے سہارا اور طاقت کا منبع بنتی ہے اور وہ جماعت کے لیے ایثار اور قربانی کرنے کے انداز سیکھتا ہے۔ جماعت صحیح معنوں میں ایک تربیت گاہ ہے جو اس کے فکر و احساس میں اعتدال پیدا کرتی ہے اور اُسے دنیائے عمل میں یہ تعلیم دیتی ہے کہ انسان کو دوسرے افراد کے ساتھ مل کر چلنے اور جدوجہد کرنے کے لیے افکار و نظریات میں کس نوعیت کی وسعت اور دوسروں کے جذبات کے بارے میں کس درجہ کا احترام درکار ہے۔ اپنی شخصیت کے صحیح تحفظ اور انا پرستی اور خود پسندی کے مرض سے بچنے کے لیے اجتماعی زندگی کی ذمہ داری قبول کرنے سے زیادہ کوئی مؤثر تدبیر نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی بھلائی کے علاوہ خود امّت کی بھلائی بھی اس میں ہے کہ افراد اپنی انفرادی حیثیت میں نہیں بلکہ جماعتوں کے ساتھ منسلک ہو کر امّت کی بہتری کے لیے کوشش کریں۔ اگر مرض ایک ہو یا انحطاط کسی مخصوص گوشے میں ہو یا اصلاح کی ضرورت کسی ایک شعبے میں ہو تو ایک جماعت سے کام چل سکتا ہے۔ مگر جہاں امراض لاتعداد ہوں اور وہ زندگی کے سارے گوشوں میں پوری طرح سرایت کیے ہوئے ہوں اور ہر زاویۂ نگاہ اور ہر پہلو سے اصلاح کی اشد ضرورت ہو تو ان حالات میں عملی طور پر یہی بات ممکن ہے کہ مختلف جماعتیں اصلاحِ حال کے لیے سرگرمِ عمل ہوں اور جس جس میدان میں وہ زیادہ مؤثر طریق سے کوشش کر سکتی ہیں اُسی میدان میں جدوجہد کریں۔ البتہ اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ اُن سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جو ملّت کے اجتماعی مفاد کو نقصان پہنچانے والی ہو۔ اگر ان جماعتوں میں خلوص اور امّت کے وسیع تر مفاد کا احساس موجود ہوگا تو ان کی کوششوں سے ملّت کی بھلائی ہی ہوگی خواہ ان کوششوں کا انداز جداگانہ اور دائرۂ عمل ایک دوسرے سے الگ ہی کیوں نہ ہو۔ ان کے درمیان اختلاف کے باوجود اُمّت کی خیر خواہی کے معاملے میں اتفاق و اتحاد ہوگا اور آپس میں اشتراکِ عمل کی راہیں نکلتی رہیں گی۔

قومی قیادت پر اس وقت جو ایک اور اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ معیشت کے موجودہ نظام میں اساسی تبدیلی ہے۔ اس وقت ملک میں جو نظام رائج ہے وہ سرمایہ داری کی بنیاد پر قائم ہے جس کا خاصہ یہ ہے کہ سرمایہ کو معاشی ڈھانچے کی اصل قرار دے کر محنت کشوں کی قدر متعین کی جائے۔ یہ پورا نظام لوٹ کھسوٹ پر قائم ہوتا ہے اور اس میں سرمایہ دار طبقوں کو استحصال کی کھلی چھوٹ حاصل ہوتی ہے۔ اس کا طریق یہ ہے کہ زرداروں کو غریب طبقوں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے کھلے مواقع حاصل ہوں اور وہ ان کی مشقت کے ثمرات کا نہایت ہی معمولی حصہ اُن کی طرف منتقل کریں اور باقی بیشتر حصہ خود سنبھالے جائیں۔ اشتراکی سرمایہ داروں کے اس طرزِ عمل کو ناجائز انتفاع سے تعبیر کرتے ہیں اور سرمایہ داری میں یہ طریق کار تشکیلِ سرمایہ (CAPITAL FORMATION) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ سرمایہ داری کے حامی اس کے جواز میں یہ کہتے ہیں کہ دولت جب تک چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ آجائے اس وقت تک مزید سرمایہ کاری کس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرح ہو سکتی ہے۔ اشتراکی اس ناجائز دولت کو جسے وہ اپنی اصطلاح میں قدرِ زائد (SURPLUS VALUE) کے نام سے پکارتے ہیں۔ افراد کی تحویل میں دینے کے بجائے حکومت کی تحویل میں دینے پر اصرار کرتے ہیں چنانچہ اگر دقّت نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں کے مابین اختلاف مقصد کا نہیں بلکہ تدبیر منزل کا ہے۔ دونوں نظاموں میں اصل اہمیت بے جان سکوں کو ہی حاصل ہے اور انسان ان کے مقابلے میں کسی قدر و قیمت کا حامل نہیں سمجھا جاتا۔

اس وقت اس ملک میں چونکہ سرمایہ داری کو فروغ حاصل ہے اس لیے اس کی ساری لعنتیں ہمارے معاشرے پر پوری طرح مسلط ہیں۔ ملکی دولت کا ۸۰ فیصد حصہ صرف بیس خاندانوں کی تحویل میں ہے اور وہ یہی اس دولت کے بل بوتے پر محنت کشوں کا خون نہایت بری طرح سے چوس رہے ہیں۔ یہ خاندان امورِ مملکت میں بڑے مؤثر انداز میں شریک ہیں اور قانون، پولیس اور دوسری انتظامی مشینری ان کی پشت پناہی کے لیے وقف ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک نہایت مختصر سے طبقے کو تو زندگی کی ساری آسانیاں اور سہولتیں میسر ہیں مگر باشندگانِ ملک کی عظیم اکثریت کے لیے جسم اور روح کے رشتے کو قائم رکھنا ایک دردناک عذاب معلوم ہوتا ہے۔

اشتراکیوں کے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ ملک کی اجتماعی تعمیر میں سرمایہ کو اہمیت تو یہی حاصل رہے مگر محنت کشوں کا خون چوسنے کا کام چند افراد سے لے کر حکومت کے سپرد کر دیا جائے۔

اس وقت ملک میں ان دونوں نظاموں کے حامیوں کے درمیان سخت رسہ کشی ہو رہی ہے۔ عوام سرمایہ داری کی ستم رانیوں اور مظالم سے تنگ آئے ہوئے ہیں اور اصلاح حال کے لیے شدید آرزومند ہیں اور اس بات کے متمنی ہیں کہ ملک میں ان کے ساتھ جانوروں کا نہیں بلکہ انسانوں کا سلوک کیا جائے اور قومی دولت سے انہیں کم از کم اتنا حصہ تو دیا جائے جس سے وہ قدرے آرام کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ ان کے دل میں معاشی ناانصافی کے خلاف سخت نفرت اور حقارت ہے اور وہ اس لعنت سے ہر قیمت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر دوسری طرف جب اُن کی نگاہ اشتراکیت کی ان جکڑبندیوں کی طرف جاتی ہے جو روٹی کے بدلے انہیں لازمی طور پر قبول کرنا پڑتی ہیں تو وہ ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں۔ اس وقت ایک عام پاکستانی سخت قسم کے جسمانی اور ذہنی عذاب میں مبتلا ہے اور قائدین ملک سے سراپا سوال بن کر پوچھتا ہے کہ آخر اُن کے پاس اس کے اس درد کا مداوا کیا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جس میں ہمارے ملک کے تمام سوچنے سمجھنے والے افراد کو اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کر کے اس معاشی استبداد کو دور کرنے کی فکر کرنا چاہیئے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے انہیں اس بات کا فیصلہ کرنا چاہیے کہ کیا یہ معاشی ناانصافی اس ملک کے رہنے والوں کا مقدر بن چکی ہے اور اس سے نجات کی کوئی اور صورت بجز اس کے ممکن نہیں کہ پوری قوم کو سرمایہ دار کے استبداد سے نکال کر مملکت کے استبداد کے حوالے کر دیا جائے۔ جب تک سرمایہ معاشی نظام کی اساس رہے گا۔ اس وقت تک ان دو صورتوں کے علاوہ کوئی تیسری صورت کبھی سامنے نہ آسکے گی۔ لیکن یہ سخت نادانی ہوگی اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ تیسری کوئی صورت ممکن ہی نہیں۔

اسلام نے نوع انسانی کو جو اقدارِ حیات دی ہیں انہوں نے معاشی دائرے میں یہ عظیم انقلابی تصور پیش کیا ہے کہ معیشت میں اصل اہمیت سرمایہ کو نہیں بلکہ ذی روح انسان کو حاصل ہے۔ اس تصور کی بنیاد پر ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کی جاسکتی ہے جو ہر قسم کے استحصال اور جبر و استبداد سے پاک ہو۔ یہ اگرچہ ایک مشکل کام ہے، لیکن اگر اس تصور کی اساس پر ایک صحیح لائحہ عمل تیار کر لیا جائے تو یہ نہ صرف اہل پاکستان کے دکھوں کا علاج ہوگا بلکہ سرمایہ داری کے رُوح فرسا مظالم اور اشتراکیت کے دردناک عذاب سے نوعِ انسانی کو نجات دلا سکے گا۔ خدا کرے کہ ہماری قیادت خلوص نیّت کے ساتھ اس عظیم کام کی طرف بھی متوجہ ہو۔

© rasailojaraid.com